Majallah Tahqiq
Research Journal of
the Faculty of Oriental Learning
Vol: 34, Sr.No.90, 2013 pp 05 - 22

مجلہ تحقیق
مجلہ کلیہ علوم شرقیہ
جلد ۳۴، جنوری۔ مارچ ۲۰۱۳ء، شمارہ ۹۰

اردو میں غزل مخالف تنقید ——— ایک جائزہ

ڈاکٹر ضیاء الحسن☆

Abstract:

Ghazal is considered the most significant form of Urdu and Persian classical poetry. In Urdu Ghalib, Meer, and Dard took this form of poetry to its absolute height. But in modern times there are some literary critics who have focused on negating Ghazal. In this article the research scholar has evaluated and analyzed the Ghazal opponent movement in Urdu literature, which begins with the lecturer delivered by Muhammad Hussain Azad in 1867. This article deals with the tradition of Ghazal opponent movement in the larger context.

Key words: Urdu poetry, Ghazal, Ghazal opponent movement.

آغاز محمد حسین آزاد کے اس لیکچر سے ہوا جو انھوں نے انجمن پنجاب کے جلسے میں ''نظم اور کلام موزوں کے باب میں خیالات'' کے عنوان سے ۱۸۶۷ء میں دیا۔ قبل ازیں غزل کی تنقید تذکرہ نگاری تک محدود تھی۔ غزل کلاسیکی شاعری کی سب سے مستحکم صنف سخن تھی اور اپنے عہد کی سیاست، معاش، معاشرت، ثقافت اور تہذیب کو بیان کرنے پر مکمل طور پر قادر تھی۔ اس دور میں غزل نے تصوف اور عشق سے اپنا علامتی واستعاراتی نظام وضع کیا۔ برصغیر پر برطانوی اقتدار کے بعد ہند اسلامی تہذیب جو خالص ہندوستانی تہذیب کا درجہ اختیار کر چکی تھی، برطانوی تہذیب سے اثر پذیر ہونا شروع ہوئی۔

☆ ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اردو، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستانیوں نے برطانوی اقتدار کو ذہنی طور پر قبول کر لیا جس سے ہند برطانوی تہذیب کو تیزی سے پنپنے کا موقع ملا۔ اب ایک طرف تو غزل کا کلاسیکی علامتی و استعاراتی نظام کثرت استعمال سے اپنی معنویت گنوا چکا تھا اور دوسری طرف وہ بدلتی ہوئی زندگی کو بیان کرنے سے قاصر تھا۔ اس صورت حال میں آزاد نے اپنا مشہور لیکچر دیا جس نے جدید نظم گوئی کی راہ ہموار کی۔ اس مضمون میں اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ ادب چوں کہ کوئی جامد چیز ہے اور نہ زمانہ ٹھہرا رہتا ہے، وقت کے ساتھ زندگی بدلتی رہتی ہے، اس لیے ادبی اقدار کو بھی تبدیل ہوتے رہنا چاہیے۔ اردو شاعری چند موضوعات و اسالیب تک محدود ہو کر رہ گئی ہے جن کا بدلتی ہوئی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ شعوری طور پر کوشش کی جائے کہ ادب واقعیت اختیار کرے اور اپنے زمانے کے اہم مسائل و معاملات کو موضوع بنائے تا کہ اس کی افادیت اپنے زمانے کے لیے قائم ہو سکے۔ آزاد نے اس زمانے میں یہ لیکچر دیا، جب تہذیب الاخلاق جاری ہوا تھا اور نہ حالی کے ذہن میں مقدمہ شعر و شاعری کا خیال پیدا ہوا تھا۔ یوں آزاد پہلے نقاد ہیں جنھوں نے بدلتی ہوئی زندگی کے تقاضوں کا ادراک کیا اور ادب کو اس سے ہم آہنگ کرنے کا سوچا۔

> ''اے گلشنِ فصاحت کے باغبانو! فصاحت اسے نہیں کہتے کہ مبالغے اور بلند پروازی کے بازوؤں سے اڑے، قافیوں کے پروں سے فرفر کرتے گئے اور شوکت الفاظ کے زور سے آسمان پر چڑھتے گئے اور استعاروں کی تہہ میں ڈوب کر غائب ہو گئے۔ فصاحت کے معنی یہ ہیں کہ خوشی یا غم، کسی شے سے رغبت یا اس سے نفرت، کسی شے سے خوف یا خطر یا کسی پر قہر یا غضب، غرض جو خیال ہمارے دل میں ہو، اس کے بیان سے وہی اثر ہو، وہی جذبہ، وہی جوش سننے والوں کے دلوں پر چھا جائے جو اصل مشاہدے سے ہوتا ہے''۔ (۱)

درج بالا اقتباس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ آزاد استعارے کو برا جانتے تھے اور نہ یہ کہ وہ اردو یا مشرقی شاعری کو کم تر سمجھتے تھے۔ آزاد تو خود استعارے کے بغیر لقمہ نہیں توڑتے تھے۔ یقیناً نئی شاعری کی تحریک کے پس منظر میں نو آبادیاتی فکر بھی کارفرما ہو گی لیکن اصل مسئلہ یہ تھا کہ اردو شاعری

کا کلاسیکی علامتی و استعاراتی نظام اپنی معنویت گم کر چکا تھا اور نئی زندگی کے تخلیقی اظہار پر قدرت نہیں رکھتا تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ شاعروں کی اکثریت اسی پرانے استعاراتی و علامتی نظام میں غزل گوئی میں مصروف تھی۔ اگر چہ داغ اور ان کے ہم عصر شاعروں کی شاعری کے نئے تجزیات سامنے آچکے ہیں اور ہندوستان کے تہذیبی، سیاسی اور معاشرتی پس منظر میں ان کی نئی معنویت دریافت کی جا چکی ہے لیکن اس کے باوجود آج ہم اس بات کو زیادہ گہرائی سے سمجھ سکتے ہیں کہ اس شاعری کی تاثیر کہاں گم ہوئی۔ یہ بات درست ہے کہ آزاد نے ان مسائل کو اتنی وضاحت سے بیان نہیں کیا لیکن اس کا جو حل تجویز کیا، اس سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ اردو شاعری کی لفظیات اور استعارات و علامات میں توسیع و اضافے کے آرزومند تھے۔

> ''ہمیں چاہیے کہ اپنی ضرورت کے بموجب استعارہ اور تشبیہہ اور اضافتوں کے اختصار فارسی سے لیں، سادگی اور اظہارِ اصلیت کو بھاشا سے سیکھیں لیکن پھر بھی قناعت جائز نہیں کیوں کہ اب رنگ زمانے کا اور ہے۔ ذرا آنکھیں کھولیں گے تو دیکھیں گے کہ فصاحت و بلاغت کا کارخانہ کھلا ہے جس میں یورپ کی زبانیں اپنی اپنی تصانیف کے گلدستے، ہار طرے ہاتھوں میں لیے حاضر ہیں اور ہماری نظم خالی ہاتھ الگ کھڑی منہ دیکھ رہی ہے۔''(۲)

آزاد کلاسیکی اردو غزل کے بجائے موضوعاتی نظم کو اردو میں رائج کرنا چاہتے تھے لیکن وہ اردو شاعری میں موضوعاتی و اسلوبیاتی تبدیلیوں کی راہ بھی ہموار کر رہے تھے۔ اگر چہ الطاف حسین حالی بھی نئی شعری ہیئتوں کی بات کرتے ہیں لیکن مقدمہ شعر و شاعری میں انھوں نے غزل کے حوالے سے ۱۸۹۳ء میں جو تنقیدی نکتہ نظر دیا، غزل کی تنقید اس سے بہت کم باہر جا سکی ہے، خاص طور پر صنف غزل پر اعتراض کرنے والے نقاد، اس صنف کے خلاف حالی سے زیادہ دلائل نہیں لا سکے۔ حالی نے غزل پر جو اعتراضات کیے، انھیں کے الفاظ میں درج ذیل ہیں۔

۱۔ ''غزل میں..... کوئی خاص مضمون مسلسل بیان نہیں کیا جاتا بلکہ جدا جدا خیالات

الگ الگ کی بیتوں میں ادا کیے جاتے ہیں۔''

۲۔ ''غزل کی حالت فی زمانہ نہایت ابتر ہے۔ وہ محض ایک بے سود اور دور از کار صنف معلوم ہوتی ہے.....الفاظ میں صنعت اور خیالات میں رکاکت و سخافت یوماً فی یوماً بڑھتی جاتی ہے۔''

۳۔ ''غزل میں اعلیٰ درجہ کا شعر ایک یا دو سے زیادہ نہیں نکل سکتا۔ باقی بھرتی ہوتی ہے۔''

۴۔ ''اگلے شعرا شتر گربگی کی کچھ پرواہ نہ کرتے تھے۔''

۵۔ ''ہمارے لٹریچر میں ضائع لفظی کی لے بڑھتے بڑھتے آخر کار محض الفاظ پرستی باقی رہ گئی اور معنے کا خیال بالکل جاتا رہا۔''

۶۔ ''ردیف اور قافیہ کی گھاٹی خود دشوار گزار ہے تو اس کو اور زیادہ کٹھن اور نا قابلِ گزر بنانا انھیں لوگوں کا کام ہوسکتا ہے جو معنے سے کچھ سروکار نہیں رکھتے اور شاعری کا مآل محض قافیہ پیمائی سمجھتے ہیں۔''

۷۔ ''لکھنو میں متاخرین نے سادگی اور صفائی کا غزل میں بہت کم خیال رکھا ہے۔''(۳)

حالی نے غزل کی خامیوں پر کم بات کی اور ان کی اصلاح پر زیادہ توجہ دی۔ ان کا خیال تھا کہ اردو ادب کی جملہ اصناف میں غزل کو یہ فوقیت حاصل ہے کہ وہ ہندوستان کے باشندوں کے مزاج میں زیادہ دخیل ہے۔ اگر چہ وہ ایسی صنف سخن کو وقت کی ضرورت سمجھتے تھے جو تسلسل اور ربط کے ساتھ خیالات بیان کر سکتی ہو لیکن غزل کو بھی ناگزیر سمجھتے تھے، اس لیے ان خامیوں کو دور کرنا چاہتے تھے جنھوں نے غزل کو محدود کر دیا تھا۔ غزل کی ریزہ خیالی اس کے مزاج کا لازمہ تھی، اس لیے وہ اسے تو قبول کرتے ہیں لیکن دیگر خامیوں کو دور کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ انھوں نے غزل کی اصلاح کے لیے چار مشورے دیئے جن میں سے تین کا تعلق موضوع اور ایک کا تعلق اسلوب کے ساتھ ہے۔

> ''یہ صحیح نہیں ہے کہ جو خیالات اگلوں نے زمانہ کے اقتضا سے یا جذبات کے جوش میں ظاہر کیے ہیں، ہم بھی وہی راگ گاتے رہیں اور انھیں کے خیالات کا اعادہ کرتے رہیں۔ نہیں بلکہ ہم کو چاہیے کہ اپنی غزل کو خود اپنے خیالات اور

اپنے جذبات کا آرگن بنائیں۔''(۴)

موضوع کو وسعت دینے کے ساتھ انھوں نے زبان کو وسعت دینے کی بات بھی کی۔ ان کا خیال تھا کہ زبان کو آہستہ آہستہ نیچرل طریقے سے تبدیل کرنا چاہیے کیوں کہ یکلخت نامانوس الفاظ انسانی طبائع قبول نہیں کرتے۔

''یہ ممکن ہے کہ کسی قوم کے خیالات میں دفعتاً ایک نمایاں ترقی اور وسعت پیدا ہو جائے مگر زبان میں دفعتاً وسعت پیدا نہیں ہوسکتی بلکہ نامعلوم طور پر بیان کے اسلوب آہستہ آہستہ اضافہ کیے جاتے ہیں۔ سلسلۂ سخن میں نئے اسلوب جہاں تک ممکن ہو کم اختیار کیے جائیں اور غیر مانوس الفاظ کم برتے جائیں مگر نامعلوم طور پر رفتہ رفتہ اُن کو بڑھاتے رہیں۔''(۵)

حالی نئی لسانی تشکیل کی بات ہی نہیں کرتے بلکہ اس کے لیے اصول بھی مہیا کرتے ہیں۔ یہاں وہ انسانی نفسیات سے گہری آگاہی کا اظہار کرتے ہیں۔ یہاں مجھے ڈاکٹر سجاد باقر رضوی کی بات یاد آرہی ہے جو انھوں نے راشد کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھی تھی کہ راشد مانوس اور نامانوس لفظوں کے امتزاج سے اپنی شعری فضا تشکیل دیتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے قاری میں خوشگوار حیرت پیدا ہوتی ہے۔ مسرت نہ بالکل نامانوسیت میں ہے اور مانوسیت میں۔ شاعر مانوس اور نامانوس کو ملا کر ایک نئی ترکیب ایجاد کرتا ہے۔ یہی تخلیقی عمل ہے۔ ساٹھ کی دہائی میں اردو ادب میں افتخار جالب کی لسانی تشکیلات نے جو توڑ پھوڑ کی اور جس شدت سے اسے رد کیا گیا، اس کے بعد حالی کی رائے اور بھی صائب معلوم ہوتی ہے۔

حالی کے بعد جس نقاد کی غزل پر آرا نے اردو دان طبقے کو چونکایا، وہ کلیم الدین احمد ہیں۔ ان کا فقرہ، ''غزل نیم وحشی صنف سخن ہے''، آج بھی ادبی منظرنامے میں گونجتا محسوس ہوتا ہے۔ اگرچہ ڈاکٹر انور سدید کی تحقیق کے مطابق یہ بھی ان کا اپنا نہیں ہے بلکہ جارج سنتیانا سے مستعار ہے لیکن غزل کے شاعر اور قاری پر یہ وار کلیم الدین احمد نے ہی کیا ہے۔ انھیں اردو غزل پر جو اعتراضات ہیں، انہی کی

زبانی سنیے:

۱۔ ''اردو شاعری کے ایک بڑے حصے میں خیال بندی اور قافیہ پیمائی کے سوا کچھ نہیں۔''

۲۔ ''اردو شاعری نے فارسی کے سائے میں پرورش پائی..... فارسی بحور اور قواعد عروض کی تقلید تو لازمی تھی، تعجب یہ ہے کہ ان بحور اور قواعد میں کبھی کسی کو تغیر یا اضافہ کا خیال بھی نہ ہوا۔ اسی افتادِ طبع کا نتیجہ تھا کہ مختلف بندشیں اور سارے مضامین بھی فارسی سے اخذ کر لیے گئے۔''

۳۔ ''غزل میں بعض خیالات محذوف ہیں۔ اشعار کی ترتیب بے ترتیب ہے۔ دماغ کو ایک شعر سے دوسرے شعر تک گزرنے میں رکاوٹ محسوس ہوتی ہے۔ یہاں ایک مکمل تجربہ نہیں البتہ مختلف تجربوں کے ٹکڑے ہیں۔''

۴۔ ''غزل کے شعروں میں اور یہ شعر کسی رنگ کے کیوں نہ ہوں، کوئی ربط نہیں ہوتا۔''

۵۔ ''غزل سے قطع نظر اگر ہر شعر کو ایک مکمل نظم تصور کیا جائے تو شعر پر بھی نیم وحشی صنف سخن ہونے کا الزام عائد ہوگا۔ شعر مفرد کے مختصر پیمانے میں کسی پیچیدہ جذباتی یا تخیلی تجربے کے سمانے کی گنجائش نہیں۔''

۶۔ ''اکثر اعلیٰ و ادنیٰ شعر ایک جگہ اکٹھا ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے طبیعت منغّض ہو جاتی ہے۔''(۶)

اگر غور کیا جائے تو کلیم الدین احمد نے غزل پر جتنے بھی اعتراضات کیے ہیں، ان سے پہلے حالی مقدمہء شعر و شاعری میں زیادہ بہتر لب و لہجے اور استدلال کے ساتھ کر چکے تھے۔ صرف وہی نہیں بلکہ نظم طباطبائی ہوں یا عظمت اللہ خاں، سب نے انہی اعتراضات کا اعادہ کیا ہے۔ ہر معترض کا اسلوب اپنا اپنا ہے لیکن کوئی بھی حالی سے زیادہ گہرائی میں جا کر غزل کے نقائص بیان نہیں کر سکا۔ حالی کا کمال یہ ہے کہ وہ غزل کے محاسن بھی بیان کرتے ہیں اور اس کی اردو ادب میں ناگزیریت سے بھی آگاہ ہیں۔ حالی نے قصیدہ، مرثیہ کو رد کیا اور اردو مثنوی سے مطمئن نہ ہونے کے باوجود اس کے امکانات و اصلاح پر لکھا۔ کلیم الدین احمد اردو شاعری پر ایک نظر میں اس حوالے سے بھی ان

کے ہم خیال نظر آتے ہیں۔عظمت اللہ خاں مسدس اور مثنوی کو بھی رد کرتے ہیں۔ان کے مضمون ''اردو شاعری'' کا اصل موضوع غزل کا استرداد ہے جس کا نقطہ عروج ان کا یہ فقرہ ہے جو کلیم الدین احمد کے جملے جتنا ہی معروف ہے:

> ''اب وقت آگیا ہے کہ خیال کے گلے سے قافیہ کے پھندے کو نکالا جائے اور اس کی بہترین صورت یہ ہے کہ غزل کی گردن بے تکلف اور بے تکان ماردی جائے''۔(۷)

غزل پر ایک نیا اعتراض آل احمد سرور نے کیا۔ان کا خیال تھا کہ اردو کے تخلیق کاروں کے مزاج پر غزل کو تصرف حاصل ہے اور دیگر اصناف ادب پر بھی اس کے گہرے اثرات ہیں۔ہم اشاروں میں سوچنے کے عادی ہو گئے ہیں جس کی وجہ سے طویل بیانیہ ہمارے ہاں کم ہے۔ہم Cleche میں سوچنے اور بات کرنے کے عادی ہو گئے ہیں جس کی وجہ سے بے معنویت کا شکار ہیں۔

> ''مجھے اس کا احساس ہے،غزل کی وجہ سے ذہنی پراگندگی کو ترقی ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے یہاں بڑی نظمیں اور ناولیں کم ہیں،غزلیں اور افسانے زیادہ ہیں۔مجھے اس کا بھی اعتراف ہے کہ غزل کی بیشتر علامات اب اتنی پامال ہو چکی ہیں کہ ان میں تازگی باقی نہیں رہی۔پھر یہ بھی ہے کہ غزل کی وجہ سے آدمی ساری عمر اشاروں میں باتیں کرتا ہے اور شارٹ ہینڈ بولتا ہے، اسے تفصیل، وضاحت، تعمیر کے حسن سے بالکل مس نہیں ہوتا۔یہی وجہ ہے کہ بہت سے نظم کے شاعر تک نظم کے نام سے غزلیں لکھتے ہیں۔وہ نظم کے پلاٹ، ترکیب اور منتہائے خیال کو جانتے ہی نہیں''۔(۸)

لیجیے، سرور صاحب نے ہمیں اپنی خامیوں اور عیبوں کا جواز فراہم کرنے کا گُر سکھا دیا ہے۔

اب ہم کہہ سکتے ہیں کہ ۱۹۵۸ء میں ایوب خاں نے مارشل اس لیے لگایا کیوں کہ غزل نے ہمیں

انفعالی رویے دیئے، ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان اس لیے الگ ہوا کیوں کہ غزل کا ہر شعر الگ اکائی ہوتا ہے اور انفرادی طور پر پنپنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ضیاء الحق نے اسلام کے نام پر گیارہ سال گزار دیئے کیوں کہ اقبال نے غزل میں عربی روایات کا احیاء کرنے کی کوشش کی۔ ہم گزشتہ ساٹھ سال سے قرضوں پر اس لیے گزارا کر رہے ہیں کیوں کہ غزل نے بھی فارسی سے عروض و علامات قرض لی ہیں۔ یہ تو خیر جملہء معترضہ ہوا۔ سرور کا بنیادی نظریہ قابل توجہ ہے کہ مجموعی ادبی فضا، ہر صنف ادب پر اثر انداز ہو رہی ہوتی ہے لیکن سرور صاحب کے عہد تک طویل نظم یا ناول کی کمی کی وجہ غزل یقیناً نہیں ہے کیوں کہ جس زمانے میں سرور صاحب یہ مضمون لکھ رہے تھے، اُس وقت تک چالیس ہزار سے زائد صفحات پر مشتمل داستان امیر حمزہ لکھی جا چکی تھی، سرشار فسانۂ آزاد لکھ چکے تھے جنھیں مختصر نویسی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اسی طرح نظم میں بھی سینکڑوں ہزاروں اشعار پر مشتمل طویل مثنویاں بھی لکھی جا چکی تھیں۔ سرور صاحب کا عہد نظم اور ناول کا ابتدائی دور تھا۔ ابتدائی دور میں معیار و مقدار دونوں ہی کم ہوتے ہیں۔ آج نہ اردو میں طویل نظم کی کمی ہے، نہ اعلیٰ درجے کے ناولوں کی۔ وقت کے ساتھ ان اصناف میں ہونے والے ارتقائی عمل نے معیار و تعداد دونوں میں اضافہ کیا ہے حالانکہ غزل آج بھی سرور صاحب کے عہد سے بھی زیادہ تعداد میں لکھی جا رہی ہے۔

ترقی پسندوں کو غزل رجعت پسند صنف نظر آئی جس میں نہ انقلاب کی گھن گرج ہے، نہ مزدور کے مسائل، بس تصوف کا راگ ہے جو انفعالی ذہن پیدا کر رہا تھا۔ غزل جاگیرداری دور کی یادگار تھی جو بادشاہوں اور امراء کے ذہنی تعیش کا ذریعہ تھی۔ وہ تو اللہ بھلا کرے سجاد ظہیر کا جنھوں نے ابتدا ہی سے یہ خناس تند مزاج نوجوان ترقی پسندوں کے ذہن سے نکالا اور غزل کو ان کے بے پایاں عتاب سے بچا لیا۔

> ''لچر گوئی کو صرف غزل کے ساتھ منسوب کرنا، اس کے ساتھ بڑی ناانصافی ہو گی۔ نظم گو شاعر جن میں ترقی پسند شاعر بھی شامل ہیں، اس میدان میں بلاشبہ غزل گویوں کے شانہ بشانہ دوڑ رہے ہیں''۔ (۹)

سجاد ظہیر اور کچھ دیگر ترقی پسند نقادوں کی کاوشوں سے غزل پر ہونے والا یہ اعتراض تو رفع ہوا اور تقریباً تمام ہی ترقی پسند شاعروں نے خوب دھوم دھام سے غزل میں طبع آزمائی کی لیکن مذکورہ بالا تمام اعتراضات کی گونج آج بھی سنائی دیتی رہتی ہے۔ آج بھی کسی نہ کسی کو ہوک اٹھتی ہے اور وہ غزل کے پیچھے دوڑ پڑتا ہے۔ بجائے اس کے کہ نظم گو اعلیٰ درجے کی نظمیں لکھیں، ناول و افسانہ نگار اعلیٰ درجہ کا فکشن تخلیق کریں، اپنی نااہلی اور تخلیقی بنجر پن کا غصہ غزل بیچاری پر اتارتے رہتے ہیں۔ میں معذرت خواہ ہوں کہ غزل کے لیے بے چاری کا لفظ استعمال کیا کیوں کہ غزل تو آج بھی پورے کروفر اور جلال و جمال کے ساتھ اردو ادب کی مجلس میں رونق افروز ہے۔ آج بھی غزل گو شاعروں کی تعداد دیگر تمام اصناف ادب سے فزوں ہے۔ معیار کی افراط و تفریط کی شرح بھی ان سے کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔ جتنے فی صد بے ہودہ اور لغو نظم گو اردو رسائل و جرائد کی زینت بنتے ہیں، غزل گو شعراء کا تناسب بھی تقریباً وہی ہے لیکن غزل پر عتاب کا جو سلسلہ ۱۸۵۷ء کے بعد شروع ہوا، آج تک جاری ہے۔ آخر اس کی کیا وجوہات ہیں؟ یہ نہیں کہ غزل پر ہونے والے تمام اعتراضات ناقابل اعتنا ہیں اور بدنیتی پر مبنی ہیں۔ نہیں ——— ایسا بالکل نہیں ہے۔ ان میں سے کچھ اعتراضات بغرضِ اصلاح کیے گئے، کچھ قبل از وقت تھے اور کچھ کو سمجھنے میں ناقدین سے تسامح ہوا۔ بہر حال ان اعتراضات سے غزل کو نقصان کچھ بھی نہیں ہوا بلکہ بے پناہ فوائد حاصل ہوئے۔ غزل کی وہ تہذیب جو ۱۸۵۷ء میں برباد ہوئی، اسے نئی بنیادوں پر قائم کرنے کے لیے پیش رفت ہوئی۔ غزل پر جو اعتراضات کیے گئے ہیں، ان کو نکات کی شکل میں یوں بیان کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ غزل قافیہ پیمائی ہے، تک بندی ہے۔

۲۔ غزل کی زبان، استعارات و علامات اپنے عہد کو بیان کرنے سے قاصر ہیں (جس زمانے میں یہ اعتراضات کیے گئے یعنی انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں)

۳۔ زبان و بیان میں سادگی و صفائی نہیں ہے۔

۴۔ غزل فارسی شاعری کے اثر میں قید ہے۔

۵۔ اس میں ریزہ خیالی ہے۔ اشعار میں ربط نہیں ہوتا۔ ایک ہی غزل میں مختلف و متضاد موضوعات بیان ہوتے ہیں۔ دو مصرعوں میں بڑا موضوع نہیں سمیٹا جاسکتا۔

پہلے تین اعتراضات کا تعلق موضوع اور اسلوب سے ہے۔ پہلے ان کا جائزہ لیتے ہیں، ان اعتراضات کا زمانی دائرہ ۱۸۶۷ء سے ۱۹۲۴ء تک پھیلا ہوا ہے۔ اگر اس دور کی غزل کا جائزہ لیا جائے تو یہ تمام اعتراضات بجا معلوم ہوتے ہیں۔ داغ و امیر مینائی ہوں، عناصر اربعہ (جگر، اصغر، حسرت، فانی) یا لکھنوی شاعر (عزیز لکھنوی، صفی لکھنوی، ثاقب لکھنوی وغیرہ) تمام شاعر کلاسیکی اردو غزل کی زبان اور علامتی و استعاراتی نظام میں شعر کہہ رہے تھے۔ ان کی شاعری میں نہ کوئی نیا پن نظر آتا ہے، نہ گہرائی، نہ اسلوبیاتی تنوع ہے نہ موضوعاتی۔ یہ تقریباً تمام ہی مشاعرہ باز شعرا ہیں اور اپنے کنوئیں کے قیدی۔ اس سارے دور میں حالی، اکبر، یگانہ اور فراق کل چار شاعر ایسے نظر آتے ہیں جنھوں نے غزل کی نئی تہذیب کی راہ ہموار کرنے میں کاوش کی۔ باقی شعراء بدلتی ہوئی زندگی کو اپنی شاعری میں سمونے سے قاصر نظر آتے ہیں۔ حسرت کی غزل میں کہیں کہیں سیاسی مسائل نظر آتے ہیں لیکن مجموعی طور پر یہ غزل بھی مشق سخن ہی ہے۔ حالی نے غزل کی اصلاح کے لیے جو تجاویز مقدمہ شعر و شاعری میں پیش کیں، اُن پر عمل بھی کر کے دکھایا۔ اس کو شاعری کے بجائے ماڈل قرار دینا زیادہ درست ہوگا لیکن ان کی اس کاوش کے دور رس اثرات مرتب ہوئے۔ اکبر الٰہ آبادی نے طنز و مزاح کا اسلوب اختیار کیا تو صرف غزل کا لب و لہجہ ہی تبدیل نہیں ہوا بلکہ اس کی لفظیات اور موضوعات بھی بدل گئے۔ اکبر بڑے شاعر نہ سہی (ہر شاعر بڑا شاعر ہوتا بھی نہیں ہے) لیکن حالی و اکبر کی کوششوں کو اقبال جیسا شاعر میسر آیا۔ اگرچہ فراق اور یگانہ طویل غزلیں لکھنے والے شاعر ہیں اور ان کی شاعری میں قافیہ پیمائی کا عیب نظر آتا ہے لیکن انھوں نے اپنے دور کی یبوست زدہ فضا میں اپنی اپنی کھڑکی کھول کر اسلوب کے نئے امکانات دریافت کیے۔ دونوں متضاد لب و لہجے کے شاعر ہیں اور مستقبل کی اردو غزل کی دو جہتوں کی نشاندہی کرنے والے ہیں۔ یہ چاروں عظیم شاعر نہیں ہیں لیکن بہت اچھے اور دیر تک زندہ رہنے والے شاعر ضرور ہیں۔ ان تمام شاعروں کی کاوشوں کا نقطۂ عروج اقبال کی

شاعری ہے۔ اقبال تک آتے آتے اردو غزل نے بالآخر وہ اسلوب دریافت کرلیا جو نئی تہذیب ——— ہندوستانی تہذیب کے ساتھ برطانوی تہذیب کے اختلاط سے بننے والی نئی ہند برطانوی تہذیب ——— کو بیان کرنے کی قدرت رکھتا تھا۔ اس نئی تہذیب کی سیاست، معاشی نظام، ثقافتی مظاہر اور معاشرتی اقدار گزشتہ تہذیب (ہند اسلامی تہذیب جو صدیوں کے تعامل سے ہندوستانی تہذیب کا درجہ اختیار کر چکی تھی) سے منفرد تھیں۔ غزل نے ہندوستان میں آکر یہ دوسرا دور دیکھا۔ اس کی ابتدائی جھلکیاں غالب کے آخری دور کی شاعری میں نظر آتی ہیں۔ اقبال نے اپنے ہم عصروں سے زیادہ غالب سے اپنے دور کے اسلوب کی تشکیل میں رہنمائی حاصل کی لیکن متذکرہ بالا چار شعراء کی شعوری و غیر شعوری کاوشیں بھی اقبال کے اسلوب کے پس منظر میں صاف نظر آجاتی ہیں۔ اقبال نے اگرچہ کل ۱۱۰ غزلیں کہیں لیکن اقبال کی شاعری کا گہرا مطالعہ کرنے والا قاری آسانی سے سراغ لگا لیتا ہے کہ اس کی شاعری میں معمولی تبدیلیوں کے ساتھ سب سے زیادہ استعمال ہونے والے ہیئت غزل ہے۔ اقبال تک غزل کے ارتقاء میں یقیناً نظم گوئی کے اثرات بھی نظر آتے ہیں اور خود اقبال کی غزل پر ان کی اپنی نظم گوئی کے اثرات بہت واضح ہیں لیکن یہ اثرات اتنے ہی ہیں جتنے ایک صنف دوسری صنف پر مرتب کر سکتی ہے۔ اقبال کے بعد اردو غزل اس مخصوص لسانی فضا اور علامتی و استعاراتی پیرایے سے باہر نکل آئی ہے جس کی وجہ سے وہ چند مخصوص موضوعات میں مقید ہو کر رہ گئی تھی۔ اب غزل کے تیسرے چوتھے پانچویں یا سوویں درجے کے شاعر کی شاعری دیکھ کر ان اعتراضات کی تکرار یقیناً کسی صاحب فہم کو زیب نہیں دیتی۔ صنف غزل کسی بھی تیسرے یا سوویں درجے کے شاعر کے قول و فعل کی ذمہ دار نہیں ہے۔ دیگر تمام اصناف ادب کی طرح اسے بھی اپنے وہی تخلیق کار عزیز ہیں جو اس کے لیے جگر خون کرتے ہیں، مصیبت اٹھاتے ہیں، راتوں کو جاگتے ہیں، علم حاصل کرتے ہیں، اکتساب کرتے اور ریاض کرتے ہیں۔ ہر ایرے غیرے کے جرائم کا ذمہ دار اس پاک دامن کو قرار دینا غیر ادبی ہی نہیں، غیر علمی ہی نہیں، غیر انسانی فعل بھی ہے جو پچھلے چار سو سال سے تسلسل کے ساتھ اردو ادب کی آبرو کی واحد محافظ ہے۔ بیشتر قدیم اصناف قصۂ پارینہ ہو

چکیں اور جدید اصناف ادب تو سوسوا سو سال کا قصہ ہیں۔

غزل پر یہ اعتراض کہ وہ فارسی غزل کے زیر تسلط رہی ہے، غزل کی پوری ساخت سے عدم واقفیت کو ظاہر کرتا ہے۔ دیگر اعتراضات کی طرح، اس اعتراض کا اعادہ بھی بار بار کیا گیا ہے۔ یہ اعتراض بعض شعراء کے فارسی آمیز اسلوب اور مجموعی طور پر غزل کے سرسری مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ غزل کی روایت کی تشکیل کا نصف سے زائد دور مقامی اثرات اور مقامی اصناف خصوصاً گیت اور دوہے کی روایت کے زیر اثر نظر آتا ہے۔ غزل کی ہیئت فارسی ادب کے اثر سے اردو میں رائج ضرور ہوئی اور ایرانی غزل کے لسانی و استعاراتی اثرات بھی اس پر مرتب ہوئے لیکن ہندوستان کی مقامی زبانوں اور ادب کے اثرات بھی اس پر مساوی طاقت سے مرتب ہوئے۔ گیت کے اثرات ابتدائی اردو غزل پر نمایاں ہیں۔ آہستہ آہستہ گیت کا مزاج غزل میں ضم ہوتا چلا گیا اور یوں اردو غزل فارسی غزل اور ہندی گیت کے امتزاج سے متشکل ہوئی۔ آج بظاہر غزل پر گیت کے اثر نمایاں نہیں ہیں بلکہ اس کی ساخت میں مستور ہیں لیکن اگر اردو غزل فارسی غزل سے منفرد ہے تو اس کی ایک اہم وجہ گیت کی غزل کی ساخت میں شمولیت بھی ہے۔ گیت کی روایت غزل کی روایت پر آہنگ اور مزاج دونوں صورتوں میں اثر انداز ہوئی۔ اگر چہ اردو غزل کا عروضی نظام بھی فارسی غزل سے اردو میں آیا لیکن اردو غزل نے اس عروضی نظام کو من وعن قبول نہیں کیا بلکہ مقامی شعری آہنگ کو اس میں شامل کر کے ایک بالکل نیا آہنگ حاصل کیا۔ بعض ہندی بحور کی اردو غزل میں شمولیت اس کے علاوہ ہے۔ اس نئے آہنگ کو عین ممکن ہے کوئی ماہر عروض زیادہ بہتر عروضی دلائل سے ثابت کر سکتا ہو۔ مجھ ایسا کم فہم صرف اس تبدیل شدہ آہنگ کو محسوس کر سکتا ہے جو دونوں زبانوں میں واضح طور پر مختلف محسوس ہوتا ہے۔ ایک ہی بحر کی اردو اور فارسی غزلوں کو اکٹھا پڑھ کر اس انفرادیت کا اندازہ با آسانی لگایا جا سکتا ہے۔ موجودہ دور تک آتے آتے تو اردو عروض میں اس قدر اضافے ہو چکے ہیں کہ اب اسے محض فارسی عروض کہنا حقیقت کے خلاف نظر آتا ہے۔ گیت نے اردو غزل کے مزاج کو بھی فارسی غزل کے مزاج سے مختلف کیا ہے۔ گیت ہندوستان میں حسن و عشق کے بیان اور ہجر کے حوالے سے درد، ملال،

تاسف، احساس زیاں، تکلیف، پریشانی، مصیبت، عذاب، اضطراب اور درد سے منسلک ایسی بے شمار کیفیتوں کے اظہار کی زبان رہی ہے۔ گیت کے توسط سے یہ کیفیات غزل کے مزاج کا لازمہ قرار پائی ہیں۔ تغزل کو عام طور پر موضوع یا لفظیات سے منسلک کیا جاتا ہے لیکن فی الاصل اردو غزل کا تغزل ان کیفیات کے مرہون منت ہے۔ موضوع کچھ بھی کیوں نہ ہو، الفاظ چاہے کوئی بھی ہوں، اگر ان کیفیات میں سے کسی کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے تو ایسے شعر کو تغزل سے عاری قرار نہیں دیا جاتا چاہے وہ نظم کا شعر ہی کیوں نہ ہو۔ صرف ایک مثال سے میں اپنی بات کی وضاحت کروں گا۔

آگ بجھی ہوئی ادھر ، ٹوٹی ہوئی طناب اُدھر
کیا خبر اس مقام سے گزرے ہیں کتنے کارواں

نہ یہ شعر غزل کا ہے، نہ موضوع اور نہ لفظیات لیکن ملال کی کیفیت نے اسے تغزل کی مثال بنا دیا ہے۔ اردو غزل تو غزل، نظم کے بے شمار شعر، مصرعے اور لائنیں اسی تغزل کا اظہار بن جاتی ہیں۔ گیت کی ہندی آمیز فضا، عورت کا عاشق ہونا اور دیگر کچھ خصائص ظاہری ہیں اور آسانی سے شناخت ہو جاتے ہیں لیکن گیت کی روح یعنی اس کی موسیقی اور درد جس طرح غزل کا حصہ بنے ہیں، وہ فارسی غزل سے بالکل مختلف ہے۔ یہ نہیں کہ فارسی غزل دردمندی سے تہی ہے لیکن وہ اس غزل کا لازمی حصہ نہیں ہے۔ اردو غزل میں بات تصوف کی ہو، اخلاقیات کی ہو، فلسفہ ونفسیات کی ہو یا معاشرتی و انقلابی موضوعات کی، یہی ایک خصوصیت شعر کو غزل کا شعر بناتی ہے اور غزل کا اسلوب وضع کرنے میں بنیادی محرّک کا کام دیتی ہے۔ یہ تو اردو غزل کا ہندوستان کی سرزمین سے باطنی ربط ہے۔ ظاہری طور پر بھی لفظیات، ضرب الامثال، محاورات، تشبیہات، استعارات اور علامات کی سطح پر بھی اردو غزل نے مقامی ذخیروں سے بے پناہ فیض حاصل کیا ہے۔ یہ موضوع الگ مضمون ہی نہیں مضامین کے مجموعے بلکہ مجموعوں کا متقاضی ہے۔ یہ نہیں کہ ایسا کام نہیں ہوا۔ **اردو شاعری کا مزاج، اردو غزل اور ہندوستانی ذھن و تھذیب اور قدیم دکنی شاعری میں مشترکہ کلچر** ایسی ہی کتابیں ہیں جن میں اردو شاعری اور خصوصاً غزل کے خالص ہندوستانی عناصر کی نشاندہی کی گئی

ہے۔ ان کتابوں کا انداز مدلل اور مثالیں ٹھوس اور کلاسیکی اردو شاعری سے اخذ کی گئی ہیں۔ ان کا مطالعہ کرنے کے بعد قاری آسانی سے پتہ چلالیتا ہے کہ اردو غزل ابتدا ہی سے کسی درجہ مضبوطی کے ساتھ مقامی تہذیب کے ساتھ منسلک ہوگئی تھی۔

اردو غزل پر آخری اعتراض کا تعلق غزل کی ہیئت کے ساتھ ہے۔

غزل پر یہ اعتراض کہ دو مختصر مصرعوں میں حیات و کائنات کے بڑے مسائل و معاملات کو بیان نہیں کیا جاسکتا، امر واقعہ کے خلاف ہے۔ اردو غزل میں ایسے اشعار کم از کم سینکڑوں کی تعداد میں ہیں، جن میں حیات و کائنات کے عظیم ترین موضوعات کو بیان کیا گیا ہے۔ یہ اعتراض سب سے زیادہ تندی کے ساتھ کلیم الدین احمد نے کیا اور ستم ظریفی کہ اس کا جواب بھی خود دیا اور ماننے سے انکار کر دیا۔ یہ ایک نسبتاً طویل اقتباس ہے لیکن اس پہلو کی وضاحت کے لیے ناگزیر ہے۔ انھوں نے یہ بحث ایک شعر کی تشریح کرتے ہوئے مثال کے طور پر درج کی ہے۔

ادب لاکھ تھا پھر بھی ان کی طرف
نظر میری اکثر بہکتی رہی

''اس شعر کا مطلب سمجھنے کے لیے دنیائے تغزل سے واقفیت ضروری ہے۔ اردو غزلیں اور جو خیالات ان میں ملتے ہیں، وہ ہمارے شعور میں اس شعر یا کسی شعر کی عقبی زمین کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر یہ عقبی زمین موجود ہے تو پھر شعر کا مفہوم نہایت آسانی سے سمجھ میں آجائے گا۔ شاعر کسی پر عاشق تھا۔ وہ معشوق کا ادب کرتا تھا۔ ایک روز کسی جگہ کسی محفل میں وہ معشوق کے دیدار سے شاد کام ہوا۔ اسے پاس ادب تو بہت تھا لیکن عشق کے ہاتھوں مجبور! وہ بار بار اسے دیکھا کیا۔ اس سے بے ادبی مقصود نہ تھی۔ نظر کا بہکنا عشق کے زور اور حسن یار کی کشش کا نتیجہ تھا۔ اس تشریح سے یہ مطلب نہیں کہ کسی شعر کا مفہوم سمجھنے میں دیر ہوتی ہے یا اس کے لیے غیر معمولی ادراک یا بصیرت کی ضرورت ہوتی ہے۔

نہیں؛ عقبی زمین ہمارے شعور میں موجود رہتی ہے اس لیے مطلب فوراً ذہن نشین ہو جاتا ہے لیکن پھر بھی پوری تسکین نہیں ہوتی۔ اس شعر میں گو ایک غیر متعلق واقعہ کی ترجمانی کی گئی ہے۔ شعر کی صورت ناقص اور تکمیل کی محتاج ہے، صورت کے ساتھ ساتھ نفسِ واقعہ یا تجربہ بھی تکمیل کا محتاج ہے۔ اسے دوسرے تجربوں کے ساتھ ترکیب دے کر کسی حسین، قیمتی اور پیچیدہ نقش کی تخلیق نہیں کی گئی۔ اس شعر سے یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ اس شاعر کی جذباتی دنیا میں کیا اہمیت ہے اور اس نئے تجربے نے موجودہ تجربوں کی ترکیب و ترتیب میں کیا تغیر و تبدل کیا۔ یہاں صرف ایک اضطراری کیفیت کا بیان ہے جس کی غرض و غایت سے شاعر کو کوئی بحث نہیں۔ اس لیے شعرِ مفرد بھی نیم وحشی صنف شاعری ہے۔''

غزل، ایسے مضامین کو جنھیں نظم کا شاعر طویل نظم میں یا نثر نگار پورے مضمون میں بیان کرتا ہے، دو مصرعوں میں بیان کرنے پر قادر ہے۔ کلیم الدین احمد بھی سمجھتے ہیں کہ ایسا اس علامتی و استعاراتی نظام کی وجہ سے ممکن ہوتا ہے جس سے غزل کا قاری بخوبی آگاہ ہوتا ہے اور جس کی وجہ سے وہ شعر پڑھ کر ہی اس کی موضوعاتی وسعتوں کو محسوس کرنا شروع کر دیتا ہے۔ پھر یہ کہ علامتی پیرایہ ہونے کی وجہ سے غزل کا مفہوم وقت اور حالات کے بدل جانے سے بدل جاتا ہے۔ یہ غزل کی خاص صفت ہے۔ اس کی وجہ سے غزل کی شاعری سے صرف غزل کی تہذیب سے آشنا ذہن ہی لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ شاعری کا ترجمہ ویسے ہی ناممکن خیال کیا جاتا ہے، غزل کا اور بھی ناممکن کہ اس کی موضوعاتی وسعت ترجمہ سے غارت ہو سکتی ہے۔ کلیم الدین احمد نے اس کا ایک اور نقصان بھی بتایا ہے۔

> غزل مغربی ادب میں پھل پھول نہ سکی۔ اس کی خاص وجہ وہی بے ربطی اور پراگندگی ہے جسے غزل کا طرہ امتیاز سمجھا جاتا ہے۔ (۱۱)

ترجمہ نہ ہو سکنے کے باعث غزل کے شاعر کے بین الاقوامی شاعر بننے کے امکانات معدوم ہو

جاتے ہیں، اس حوالے سے رشید احمد صدیقی نے کیا خوبصورت کہی ہے:

''غزل کے بارے میں ایک دلچسپ بات یہ بیان کی جاتی ہے کہ غزل کا شاعر عالمی شاعر نہیں بن سکتا۔ سوال یہ ہے کہ غزل گویا کسی شاعر کے لیے عالمی شاعر ہونا لازمی کیوں ہو؟ غیر منقسم ہندوستان کافی بڑا ملک تھا۔ اب بھی اس کا رقبہ کچھ کم نہیں لیکن ٹیگور کے علاوہ کتنے اور شاعر عالمی قرار پائے۔ عالمی شاعر ہونا یقیناً فخر کی بات ہے لیکن اتنا بھی نہیں، اگر کوئی شاعر عالمی نہ ہو تو اس کی شاعری ناقابلِ التفات قرار پائے..... غالب، انیس، اکبر، حالی، اقبال وغیرہ عالمی شاعر ہوئے بغیر اردو کے باکمال اور یگانہ روزگار شاعر ہیں''۔ (۱۲)

غزل کی ''ریزہ خیالی اور پراگندگی'' بھی غزل کے بنیادی مزاج کا حصہ ہیں۔ غزل اپنی بنیاد میں ایک ایسی صنف ادب ہے جو مخلوط تہذیب سے متشکل ہوئی، اس لیے موضوعاتی اختلاط و اختلاف اس کی باطنی قوت ہے۔ ایران میں یہ اس دور میں پیدا ہوئی جب عرب تہذیب ایرانی تہذیب سے مل کر نئی ایرانی تہذیب تخلیق کر رہی تھی۔ غزل کی ابتدا تشبیب کے طرز پر یک موضوعاتی یا یک کیفیاتی رہی لیکن جوں جوں نئی ایرانی تہذیب مستحکم ہوتی گئی، غزل کی ''ریزہ خیالی اور پراگندگی'' بڑھتی گئی۔ جس طرح قدیم ایرانی تہذیب اور خالص عرب تہذیب اپنی الگ شناخت بھی رکھتی ہیں اور نئی ایرانی تہذیب میں شامل ہو کر ایک نئی ساخت میں ضم بھی ہو گئی ہیں، اسی طرح غزل کا شعر اپنی علیحدہ پہچان بھی رکھتا ہے جس کا غزل سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اور غزل کی کلی ساخت کا حصہ بھی ہوتا ہے۔ غزل کو یہی صورت حال ہندوستان میں بھی پیش آئی۔ یہاں بھی اسلامی تہذیب، جو پہلے ہی نئی ایرانی تہذیب کی صورت میں عرب ایرانی تہذیب کا اختلاط تھی، ہندوستان کی مقامی تہذیب سے مل کر ہند اسلامی تہذیب کی صورت میں جلوہ گر ہوئی۔ جس طرح ایرانی تہذیب میں عرب تہذیب شامل تھی، اسی طرح ہندوستانی تہذیب بھی کئی تہذیبوں کے ہزاروں سالہ ملاپ کا نتیجہ تھی اور اپنے اندر متعدد تہذیبوں کی خوشبو لیے ہوئے تھی۔ اس پیچیدہ ترکیب میں ہر تہذیب اپنی طاقت کے ساتھ الگ وجود

رکھتے ہوئے نئی تہذیب کا حصہ بنی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ غزل کے مزاج میں آغاز سے وسیع المشربی اور انجذاب کی قوتیں شامل ہوگئیں۔ غزل اپنی موضوعاتی اور اسلوبیاتی ساخت میں ہی وسیع المشرب نہیں ہے بلکہ اپنی ہیئت میں بھی یہی آزادگی اور فراخی لیے ہوئے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مقامی اور ایرانی ادب کی بے شمار اصناف میں سے صرف غزل کو ہی ہند اسلامی تہذیب کی نمائندہ صنف ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔

غزل کے خلاف گزشتہ کچھ عرصے میں جتنے بھی اعتراض وارد کیے گئے ہیں، وہ یا تو انہی اعتراضات کی تکرار ہیں یا محض فیشن کہ غزل کے خلاف بات کرنا ہمارے ادبی فیشن کا لازمہ ہوگیا ہے۔ پہلے نظم والے اس کے خلاف لکھتے تھے، اب ماشاءاللہ فکشن والے بھی ان کے حصے دار ہو گئے ہیں۔

غزل خود پر ہونے والے اعتراضات کو غور سے سنتی ہے۔ لغو اعتراضات کو نظر انداز کر دیتی ہے لیکن ہمدردانہ مشوروں کا احترام کرتی ہے اور اپنے اندر ضروری تبدیلیاں پیدا کر لیتی ہے۔ غزل کی یہ روش اس کے زندہ وجود کی ضامن ہے۔ غزل کے شاعروں نے ہر دور میں اس صنف کو اپنے عہد کے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا ہے۔ اس کا سفر آگے کی طرف جاری ہے۔ متعدد شاعر خلوص دل سے اپنی کاوشوں میں مصروف رہتے ہیں، پھر ایک بڑا شاعر آ کر ان تمام کاوشوں کو کام میں لاتے ہوئے غزل کا وہ اسلوب دریافت کر لیتا ہے، جو اسے ہر اظہار پر قدرت عطا کر دیتا ہے۔ موجود عہد میں غزل ہند برطانوی تہذیب سے پاک امریکی تہذیب کے تشکیلی مراحل سے گزر رہی ہے۔ ابھی نہ ہمارے عہد کی تہذیبی صورت مستحکم ہے اور نہ غزل نے اپنا نیا علامتی و استعاراتی نظام دریافت کیا ہے جو نئے تہذیبی، معاشرتی، سیاسی و معاشی مسائل و معاملات کو سمیٹ سکتا ہو۔ ابھی اردو غزل، اردو شاعری، اردو ادب اور پاکستانی معاشرے کے سامنے بہت سے سوال بکھرے پڑے ہیں۔ ابھی ہمیں اپنے بنیادی سوال کو منتخب کرنا ہے۔ اگر ہم نے اپنا بنیادی مسئلہ دریافت کر لیا تو یقیناً ہماری غزل، ہماری شاعری، ہمارا ادب اور ہماری زندگی اپنی منزل کا تعین کرنے کے قابل بھی ہو سکے گی۔

حوالہ جات

۱۔ محمد حسین آزاد،نظم آزاد،مرتبہ:تبسم کاشمیری،مکتبہ عالیہ لاہور،ص:۴۵

۲۔ ایضاً،ص:۴۵

۳۔ الطاف حسین حالی،مقدمہ شعر و شاعری،شیخ مبارک علی تاجران کتب لاہور،۱۹۲۹ء،ص:۱۵۶، ۱۵۶،۹۸۔۱۹۷،۲۳۰،۲۳۲،۱۹۹۔

۴۔ ایضاً،ص:۱۷۴

۵۔ ایضاً،ص۲۰۴،۲۰۲

۶۔ کلیم الدین احمد،اردو شاعری پر ایک نظر،بک ایمپوریم پٹنہ بھارت،۱۹۸۵ء،ص: ۴۴،۵۶،۵۵،۶۳،۶۴،۷۴،۱۴۲

۷۔ عظمت اللہ خاں،سریلی بانسری،اردو اکیڈمی سندھ،کراچی،۱۹۵۹،ص:۴۶

۸۔ بحوالہ اردو شاعری پر ایک نظر،ص:۱۲۲

۹۔ سجاد ظہیر،مضامین سجاد،اتر پردیش اردو اکادمی لکھنو،۱۹۷۹ء،ص:۱۶

۱۰۔ کلیم الدین احمد،اردو شاعری پر ایک نظر،ص:۷۷۔۷۶

۱۱۔ ایضاً،ص:۶۹

۱۲۔ بحوالہ اردو شاعری پر ایک نظر،ص:۱۲۴